شریعت، طریقت اور اجتماعیت پر مبنی دینی شعور کا نقیب

ماہنامہ رحیمیہ لاہور

اگست 2026ء / ربیع الاوّل ۱۴۴۸ھ

جلد نمبر 18، شمارہ نمبر 8 قیمت: 40 روپے • سالانہ ممبرشپ: 450 روپے

بانی

حضرت اقدس مولانا **شاہ سعید احمد** رائے پوری

قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ السَّعِیۡد مسند نشین رابع خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور

مدیرِ اعلیٰ

حضرت اقدس مولانا مفتی **عبدالخالق آزاد** رائے پوری

جانشین حضرت اقدس رائے پوری رابعؒ

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن (سرپرست)

مولانا مفتی عبدالمتین نعمانی (صدر)

مولانا مفتی محمد مختار حسن (صدر انتظامیہ)

انیس احمد سجاد ایڈووکیٹ (مدیر)

ترتیبِ مضامین

- توحیدِ الٰہی کی اَساس پر اجتماعی زندگی کی تعمیر وتشکیل کی اہمیت
- رسول اللہ ﷺ سے محبت کا سبب
- حضرت ضحاک بن سفیان بن عوف عامری کلابی رضی اللہ عنہٗ
- آزادی، گمشدہ قیادت اور برِعظیم کا مستقبل
- ''نفس'' سے متعلق ''مقامات'' (3)
- عثمانی سلطنت کے نویں حکمران؛ سلطان سلیم اوّل
- قرآن حکیم؛ فکر، تدبر، تفقہ اور بصیرت کی کتاب
- قرآن حکیم کی تعلیم؛ قومی انقلاب، سیاسی استحکام اور حقیقی عزت
- انبیا علیہم السلام کے سچے وارثین کی قومی سیاسی جدوجہد
- ماہِ اگست؛ مصنوعی آزادی کے بجائے غلامی کو سمجھنے کا مہینہ
- عباس شاد بھی چلے گئے
- دینی مسائل

ارشادِ گرامی

حضرت اقدس مولانا **شاہ عبدالقادر** رائے پوری قدس سرہ — مسند نشینِ ثانی خانقاہِ عالیہ رحیمیہ رائے پور

''سلوک کیا ہے؟ (یہ) وہی کیفیت (ہے) جو انبیا علیہم السلام کو مختلف طور (طریقوں) پر یقین کی (صورت میں) حاصل ہوئی۔ (جیسے) ارشادِ ربانی ہے: ''اور ہم نے اسی طرح ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھائے اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں''۔ (6-الانعام: 75) اور (اسی طرح) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو (کوہ طور پر) تجلی ہوئی۔ (جب کہ) حضور ﷺ کو معراج ہوئی اور (آپؐ کے سلوک کی) ابتدا اس کیفیت سے ہوئی' جو (آپؐ کو) غارِ حرا میں کھینچ کر لے جاتی تھی۔ تو جو درجہ یقین کا، انبیاؑ کو حاصل ہو جاتا ہے، وہ اَوروں کو کہاں نصیب! (ہاں یہ ضرور ہے کہ) اَوروں (یعنی دیگر افراد) کو ان کے طفیل جو ملتا ہے، اس کی بھی تاثیر، صحبت اٹھانے والوں میں سے جن کو مناسبت اور استعداد جیسی (یعنی جس سطح کی) ہو' حاصل ہو جاتی ہے۔ تو یہ ''یقین'' اور یہ ''محبت'' جو مطلوب ہے، اس کے (حصول کے) ذرائع بھی مطلوب ہیں۔ تو صحبت کی کمی اور کمزوری کو پورا کرنے کے لیے اذکار اور اشغال ہوتے ہیں اور (شریعت میں) ان کی چوں کہ اصل بھی ہوتی ہے، اس لیے یہ بدعت نہیں''۔

(۱۵ر محرم الحرام ۱۳۶۶/10 ر دسمبر 1946ء، بروز: منگل، مقام: لائل پور (فیصل آباد)

(ارشادات حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، ص: 249-250، طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور)

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ رجسٹرڈ) لاہور

رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

0092-42-36307714,36369089-www.rahimia.org

Email: info@rahimia.org

تفسیر: شیخ التفسیر مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

توحیدِ الٰہی کی اَساس پر
اجتماعی زندگی کی تعمیر و تشکیل کی اہمیت

گزشتہ دو آیات (2-البقرہ:163-164) میں ملتِ ابراھیمیہ حنیفیہ کے بنیادی اُصولِ توحید کی اساس پر انسانی اجتماعیت کی تشکیل سے متعلق معاشی وسائل پر مبنی اُمور کا ذکر تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہی آسمان و زمین کی تخلیق، دن اور رات کا تغیر و تبدل، کشتیوں میں آمد و رفت کے ذریعے سے انسانی منافع کے اُمور، آسمان سے برستے پانی کے ذریعے مُردہ زمینوں کو زراعت کے قابل بنا کر زندہ کرنا، انسانی ضروریات کے لیے ہر طرح کے جانوروں کی نشو و نما اور پھیلاؤ، ہواؤں اور بادلوں کو مسخر کرنا وغیرہ ارتفاقاتِ انسانی اور وسائلِ معاش سے متعلق اُمور بیان کیے۔ اور یہ کہ صاحبانِ عقل و شعور کے لیے اس میں خدا کی بہت سی نشانیوں پر غور و فکر کی دعوت ہے۔

زیرِنظر آیات (2-البقرہ:165 تا167) میں یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ جب یہ تمام اُمور کرنے والا اور کرۂ ارض پر پیدا کیے گئے یہ تمام وسائل اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی کاریگری اور تخلیق ہے تو اسی وحدہ لاشریک کو ماننا، اُسی کی عبادت کرنا، اُسی کے پیدا کردہ ان وسائلِ معاش کو انسانیت کی ترقی کے لیے استعمال میں لانا اور پھر اُسی سے پوری شدت کے ساتھ محبت اور تعلق قائم کرنا لازمی اور ضروری ہے۔ اس حوالے سے طاقت و قوت کے مختلف مصنوعی مراکز؛ بت، فرعون و ابوجہل وغیرہ کو اللہ کی ذات کے ساتھ شریک اور دوست رکھنا قطعاً غلط ہے۔ جو لوگ ایسے ظلمِ عظیم کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ دنیا اور آخرت میں سزا اور عذاب کے مستحق ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَہُمۡ کَحُبِّ اللّٰہِ ؕ (اور بعضے لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اَوروں کو دوست، ان کی محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی): بعض لوگ ایسے ہیں جو ملتِ ابراھیمیہ حنیفیہ کے اُصولِ توحید کو نظرانداز کرتے ہوئے اللہ کو چھوڑ کر بعض دوسری چیزوں اور ظاہری مراکزِ قوت کو اللہ کا شریک بنا کر اپنا دوست بنا لیتے ہیں اور وہ اُن سے ایسی دلی محبت رکھتے ہیں کہ جو حقیقت میں صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کے لائق ہے۔

اس آیتِ مبارکہ میں ''أنداد'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ''نِد'' کی جمع ہے۔ اس کے معنی ''نظیر'' اور ''مثیل'' کے آتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگ جو کچھ چیزوں یا لوگوں کو اللہ کی ''نظیر'' اور ''مثیل'' کے طور پر اُس کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔ کائنات کے تمام وسائل پیدا کرنے اور معاشی طور پر انھیں استعمال کرنے کے لیے فائدے کے قابل بنانا اللہ تبارک وتعالیٰ کا کام ہے۔ اُس کے علاوہ کسی طاقت کے مصنوعی مرکز کو اس حوالے سے اللہ کا ''نظیر'' اور ''مثیل'' ماننا اور اُن سے محبت رکھنا کھلا تضاد ہے۔

اس آیت میں اگرچہ براہِ راست اُن لوگوں سے خطاب ہے، جو اللہ کا شریک سمجھ کر بتوں، پتھروں اور غیراللہ کی عبادت کرتے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ اس آیت میں اُن لوگوں کے اس بُرے کام کی طرف بھی اشارہ ہے، جو لوگوں کو اپنا غلام بنا کر اُن سے اپنی غلامی کرواتے اور اُن کے حلال و حرام کے فیصلے اپنے ہاتھ میں لے کر معاشی وسائل پر قبضہ کر کے اُن پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ خود کو اللہ کی ''نظیر'' اور ''مثیل'' دکھا کر عام لوگوں سے اپنی اطاعت کرواتے ہیں۔ اس طرح گویا کہ وہ خدا بن کر انسانی اجتماعیت کے بنیادی اُصولوں کو پامال کرتے ہیں۔

جاہلیت کے زمانے میں لوگ معاشی وسائل کے حصول کے لیے حکمرانوں اور مذہبی پروہتوں کو اللہ کا شریک مان کر اُن سے اپنی مالی اور معاشی حاجات مانگتے تھے۔ وہ لوگ حکمرانوں کی طاقت کے مراکز کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرا کر اُن کی غلامی میں مبتلا رہتے، جب کہ ملتِ ابراھیمیہ حنیفیہ کا بنیادی تقاضا ان انحرافات سے بچ کر صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ پوری یکسوئی سے تعلق قائم کرنا ہے۔

ایسے غلام معاشروں کے لوگ معاشی وسائل کے لالچ میں حکمران طبقوں سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جو محبت دراصل اللہ تبارک وتعالیٰ سے رکھنا چاہیے تھی۔ وہ چند ٹکوں کے لالچ میں حکمرانوں کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال کر اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحدانیت سے دور رہتے ہیں اور طاقت ور طبقوں کے لیے ایک آلہ کار بن کر کردار ادا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ حکمران طبقے بھی فرعون کی طرح یہ دعویٰ کرنے لگ جاتے ہیں کہ ''أَنَا رَبُّکُمُ الۡأَعۡلٰی'' (79-النازعات: 24) (مَیں تمھارا بڑے مرتبے والا رب ہوں)۔ یہ دعویٰ ربوبیتِ خداوندی کے خلاف کھلی بغاوت ہے اور یہ گویا کہ اللہ کے مقابلے میں ایسے ''نِد''، ''نظیر'' اور ''مثیل'' ہونے کا دعویٰ ہے، جو سراسر غلط ہے۔ چناں چہ اس آیتِ مبارکہ میں ان کے اس شرک اور کفر پر مبنی رویے کی سخت مذمت کی گئی ہے۔

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ (اور ایمان والوں کو اس سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی): جاہلیت کے زمانے کے ان گمراہ کن لوگوں کے بالمقابل اللہ پر ایمان رکھنے والے عقل مندوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے شدید محبت رکھتے ہیں۔

نورِایمانی کے آجانے سے انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ سے تعلق کا ایسا ''نُقطۂ حُبّیہ'' پیدا ہو جاتا ہے، جو ہمہ وقت ذاتِ باری تعالیٰ کی محبت میں ڈوبا ہوا اور اُس کی شرابِ محبت سے لبریز رہتا ہے۔ یوں اپنے دل میں زندگی کی تمام سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں اللہ کا محتاج رہتا ہے، کسی اَور طاقت ور حکمران طبقوں و پتھروں اور بتوں کو نہیں پوجتا اور ایمان پر پورے صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے اور اس کے مطابق عملی اقدامات اُٹھاتا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کا فکر اور طریقہ مشرکین کے افکار اور طریقے سے بالکل الگ ہو جاتا ہے۔ مشرک لوگ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرا کر غیراللہ کی محبت میں مغلوب ہو جاتے ہیں، جب کہ ایک مؤمن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت میں ڈوب کر اپنی زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی اعمال کرتے ہوئے انسانیت کے نفع کا بہترین نظام قائم کرتا ہے۔

وَلَوۡ یَرَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ یَرَوۡنَ الۡعَذَابَ ۙ اَنَّ الۡقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعَذَابِ (اور اگر دیکھ لیں یہ ظالم اس وقت کو جب کہ دیکھیں گے عذاب

کہ قوت ساری اللہ ہی کے لیے ہے اور یہ کہ اللہ کا عذاب سخت ہے): ملتِ ابراهیمیه حنیفیه سے وابستگی کے تمام دعوے داران — وہ بنی اسرائیلی ہوں یا بنی اسماعیلی — ہر ایک کو اپنی محبتوں کا مرکز ذاتِ باری تعالیٰ کی وحدانیت کی صورت قائم رکھنا ضروری ہے۔ خواہ انسانی زندگی میں تہذیبِ اَخلاق سے متعلق اُمور ہوں، جو گزشتہ آیات 152 تا 162 میں بیان کیے گئے اور خواہ انسانی اجتماعیت کے لیے وسائلِ معاش کی فراہمی سے متعلق اُمور ہوں، جیسا کہ آیات 163 و 164 میں واضح کیا گیا۔ گویا انسانوں کی تمام انفرادی اور اجتماعی سرگرمیوں کا مرکز توحیدِ الٰہی کے منبع سے پھوٹتا ہے اور اُس کے تابع ہے۔ جب انسان فطری طور پر غور و فکر کرتا ہے تو اُسے یہ حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ تمام تر قوتوں کا بنیادی مرکز' ذاتِ باری تعالیٰ ہے تو وہ اس سے محبت کرتا ہے۔

جو لوگ اس بنیادی اُصول سے بغاوت کر کے ذاتی تعلیم و تربیت اور اجتماعی اُمور میں اللہ کے ساتھ کسی بت، پتھر، فرعون، نمرود یا اپنے کسی حکمران طبقے کو شریک ٹھہراتے ہیں، وہ خود اپنے اوپر اور انسانی اجتماعیت پر انتہائی ظلم کرنے والے ہیں۔ انھوں نے اپنی محبتوں کا مرکز غیر اللہ کو بنا دیا۔ ایسے ظالم طبقوں پر دنیا اور آخرت میں عذابِ الٰہی نازل ہوگا۔ ایسے ظالم حکمران طبقات اور وہ لوگ جو وسائلِ معاش کے حصول کے لیے اُن کی اتباع کرنے والے ہیں، یہ تمام دیکھ لیں گے کہ ان ظالم طبقات پر نازل ہونے والے عذاب کے دن تمام طاقت اور قوت صرف اور صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہوگی۔ اور یہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی سخت عذاب دینے والا ہے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ فرماتے ہیں: ''یعنی: جن ظالموں نے خدا کے لیے شریک بنائے، اگر وہ اُس آنے والے وقت کو دیکھ لیں کہ جس وقت ان کو عذابِ الٰہی کا مشاہدہ ہوگا کہ زور سارا اللہ ہی کے لیے ہے۔ عذابِ خداوندی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اب اللہ کا عذاب سخت ہے۔ ہرگز اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ نہ ہوں اور نہ اُن سے امیدِ منفعت رکھیں''۔

چناں چہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے بنی اسرائیل نے فرعون کو بڑا رب سمجھ کر اُس کو نہ صرف اللہ کا شریک مانا، بلکہ مالی مفادات اور منفعتوں کے لیے اُس سرکش ظالم کی حکمرانی کو تسلیم کیا اور ملتِ ابراهیمیه کے قائم کردہ یوسفی اُصولوں کو نظرانداز کیا، تو اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیج کر اپنے آپ کو ''ربِّ اعلیٰ'' سمجھنے والے فرعون کو دریا میں غرق کر کے ایسے عذاب میں مبتلا کیا جو رہتی دنیا تک نشانِ عبرت بن گیا۔ جو لوگ فرعون کی طاقت اور قوت کو مان کر اُسی کو رب سمجھے ہوئے تھے، دنیا میں عذاب کے دن پتہ چل گیا کہ تمام تر قوت اور طاقت صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے ہے۔ ان ظالموں کو آخرت میں حشر میں بھی اللہ کے عذاب سے گزرنا ہوگا، یہ بات یقینی ہے کہ اُس دن طاقت اور قوت اور حقیقی حکمرانی صرف اللہ وحدہ لاشریک ہی کی ہوگی۔ کوئی دنیا کا حکمران اور ظالم اس کی بادشاہی کو چیلنج نہیں کر سکتا۔

اسی طرح مکہ کے وہ ظالم حکمران، جو اس اُمت کے فرعون کی حیثیت سے اپنی سیادت اور قیادت کو یقینی جانتے تھے اور مکہ اور گرد و نواح کے مظلوم اور کمزور لوگ محض چند معاشی وسائل کی احتیاجی میں انھیں خدا سمجھے ہوئے تھے، غزوۂ بدر کے موقع پر اُن طاقت ور حکمرانوں اور ظالموں میں سے ستر لوگوں کو قتل کر دیا گیا اور بقایا ستر لوگوں — جو مکہ کی سیاسی طاقت کا نشان تھے — کو گرفتار کر کے مدینہ لایا گیا۔ دنیا میں اللہ کی طاقت و قوت واضح ہو کر سامنے آئی اور یہ لوگ عذابِ الٰہی میں مبتلا ہو کر نشانِ عبرت بنے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ (جب کہ بیزار ہو جاویں گے وہ کہ جن کی پیروی کی تھی ان سے کہ جو ان کے پیرو (کار) ہوئے تھے، اور دیکھیں گے عذاب اور منقطع ہو جائیں گے ان کے سب علاقے): ان ظالموں پر جب دنیا اور آخرت میں عذاب نازل ہوگا اور اُن کے دلوں میں جو بتوں اور حکمران طبقوں کی محبت جا گزیں ہے، وہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جائے گی تو ان کے متبعین بھی ان سے بیزار ہو جائیں گے اور ان کی اجتماعی طاقت سے تمام رابطے منقطع ہو جائیں گے۔ خاص طور پر آخرت میں اُن کے تمام ذرائع و اسباب بھی منقطع ہو کر رہ جائیں گے۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ: ''یعنی: وہ وقت ایسا ہوگا کہ بیزار ہو جائیں گے متبوع اپنے تابع داروں سے، اور بت پرست اور بتوں میں کوئی علاقہ (تعلق) باقی نہ رہے گا، ایک دوسرے کا دشمن ہو جائے گا، عذابِ الٰہی دیکھ کر''۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ (اور کہیں گے پیرو (کار): کیا اچھا ہوتا جو ہم کو دنیا کی طرف لوٹ جانا مِل جاتا، تو پھر ہم بھی بیزار ہو جاتے ان سے، جیسے یہ ہم سے بیزار ہو گئے): آخرت میں ان کا یہ حال ہوگا کہ اُن کے تمام پیروکار طاقت کے اُن غیر الٰہی مراکز سے برأت کا اعلان کر دیں گے، جیسا کہ وہ ظالم حکمران اس وقت اپنے متبعین سے برأت کا اعلان کیے ہوئے ہوں گے۔

اس کی تشریح کرتے ہوئے ''فائدہ'' میں حضرت شیخ الہند تحریر فرماتے ہیں کہ:

''اور مشرکین اس وقت کہیں گے کہ: اگر کسی طرح ہم کو پھر دنیا میں لوٹ جانا نصیب ہو تو ہم بھی اُن سے اپنا انتقام لیں اور جیسا یہ آج ہم سے جدا ہو گئے، ہم بھی ان کو جواب دے کر جدا ہو جائیں لیکن اس آرزوِ محال سے بجز افسوس کچھ نفع نہ ہوگا''۔

كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (اسی طرح پر دکھلائے گا اللہ ان کو ان کے کام حسرت دلانے کو، اور وہ ہرگز نکلنے والے نہیں نار سے): اس کی تشریح میں حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں: ''یعنی: جیسے مشرکین کو عذابِ الٰہی اور اپنے معبودوں کی بیزاری دیکھ کر سخت حسرت ہوگی، اسی طرح پر ان کے جملہ اعمال کو حق تعالیٰ ان کے لیے موجبِ حسرت بنا دے گا''۔

ان آیاتِ مبارکہ میں یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ انسانی اجتماعیت کی تشکیل کے لیے دستیاب تمام معاشی وسائل اور اُن کے حصول کی تمام تر جد و جہد کا مرکزی نقطہ' اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا اور تہذیبِ اَخلاق کے ضمن میں ذکرِ الٰہی سے متعلق جو اُمور گزشتہ آیات میں واضح کیے گئے ہیں، اس کے مطابق اپنی تمام تر زندگی کو مرتب کرنا اور انسانی اجتماعیت کے لیے اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ معاشی وسائل کو استعمال کر کے اس کا شکر ادا کرنے میں ہے اور اسی میں دنیا اور آخرت میں کامیابی ہے۔

درسِ حدیث

از: مولانا ڈاکٹر محمد ناصر، جھنگ

رسول اللہ ﷺ سے محبت کا سبب

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رسول اللّٰه ﷺ قَالَ: "فَوَالَّذِی نَفْسی بِيَدِهِ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ اَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَ وَالِدِهٖ." (الصحیح البخاری، 14)

(حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم میں سے کوئی بھی ایمان دار نہیں ہو سکتا، تا آں کہ میں اسے اس کے والد اور اس کی اولاد سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں"۔)

اللہ کی محبت حاصل کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و اتباع لازمی ہے۔ قرآن میں ہے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، تو اللہ تم سے محبت کرنے لگو گے۔ (3- آلِ عمران: 31) اس حدیث میں بھی حضور ﷺ یہی بات فرما رہے ہیں کہ مؤمن کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا، جب تک وہ اپنی ذات اور اپنے خونی رشتوں سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے محبت نہ کرنے لگے۔

محبت کسی کو اپنے لیے قابلِ احترام اور بہتر سمجھ کر اس کو اختیار کرنے کا ارادہ کرنا ہے۔ محبت کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں، کبھی قلبی رغبت سے ہوتی ہے، یا کسی نے آپ پر کوئی احسان کیا تو آپ اس وجہ سے اس سے اُنس رکھتے ہیں یا کسی کے اونچے اخلاق کی وجہ سے فطرتاً انسان کو محبت ہو جاتی ہے یہ سب اوصاف حضور ﷺ میں جمع تھے۔ ایک مؤمن کو حضور ﷺ سے قلبی محبت آپؐ کے اونچے اخلاق، آپؐ کا جو دینی احسان ہم پر ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ انسان اس کو نظرانداز نہیں کر سکتا اور سب سے اہم بات یہ کہ دین پر عمل کرنے کا طریقہ ہمیں رسول اللہ ﷺ سے ملا، اور معاملات کرنے کے اصول و ضوابط رسول اللہ ﷺ کی زندگی مبارک سے ہمیں ملتے ہیں۔ آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ کیسا سلوک کریں۔ رشتہ داروں، بچوں، اولاد، دوست دشمن، لین دین میں نبی اکرمؐ نے جو طرزِ عمل اپنایا یہ سب مؤمن کے لیے شاہراہِ عمل ہے۔ ہم پر رسول اللہ ﷺ کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ آپؐ نے ہمیں خدا تک رسائی کا طریقہ بتا دیا۔ سب سے اہم امر یہ ہے کہ آپ اس دنیا میں کس طرح کامیاب زندگی گزاریں گے، اسی لیے پہاڑوں پر رہنے والے، بھیڑ بکریوں کو چرا کر زندگی گزارنے والے، ایک وقت پہ قیصر و کسریٰ کو شکست دینے اور ان نظاموں پر حاوی ہونے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ آخرت کی کامیابی کو دنیاوی کامیابی کی بنیاد پر حاصل کرتے ہیں کہ یہاں پر عدل قائم کریں، عمدہ اخلاقیات کا نظام قائم کریں، خدا کی مخلوق سے تعلق اچھا کریں، اچھا معاشی اور سیاسی نظام تشکیل دیں اور ایک مربوط سماجی ڈھانچہ بنائیں۔ یہ سب حضور ﷺ کی تربیت سے جماعت صحابہ کرامؓ کے ذریعے ہم تک پہنچا اور ایک ہزار سال تک دنیا میں مسلمانوں کی حکمرانی رہی۔ جب ہم پوری گہرائی سے اس کو سمجھیں گے تو اس سے محبت رسول ﷺ کا حقیقی پہلو اُجاگر ہو گا اور محبت رسول ﷺ کا حقیقی تقاضا واضح ہو گا۔

صحابہؓ کا ایمان افروز کردار

مولانا قاضی محمد یوسف، حسن ابدال

حضرت ضحاک بن سفیان بن عوف عامری کلابی رضی اللہ عنہٗ

حضرت ضحاک بن سفیان بن عوف عامری کلابی رضی اللہ عنہٗ بنو کلاب کے مشہور نجدی قبیلے بنو عامر کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپؓ کی کنیت "ابوسعید" ہے۔ آپؓ زمانۂ جاہلیت میں اپنے قبیلے کے معزز آدمی تھے۔ شعر و شاعری کا بھی شوق رکھتے تھے۔ آپؓ فتح مکہ سے کچھ عرصہ پہلے ایمان لے آئے تھے۔ آپؓ نے نبی کریم ﷺ کی صحبت اختیار کی اور مدینہ کے صحرا میں فروکش ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کو اُن لوگوں کا امیر اور اپنا والی مقرر کیا جو لوگ آپؓ کی قوم سے مسلمان ہو گئے تھے۔ آپؓ رسول اللہ ﷺ کے امین اور زبردست محافظین میں سے تھے۔ تاریخ میں آپؓ "سیافِ رسول اللہ" مشہور ہوئے، یعنی آپ ﷺ کے شمشیر بردار محافظ۔ آپؓ اپنے دور کے نامور بہادروں میں شمار ہوتے تھے اور اکیلے ایک سو سوار کے مقابلے میں آجاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے آپؓ کے بارے میں اس کی گواہی دی تھی۔

ربیع الاول نو ہجری میں حضور اکرم ﷺ نے حضرت ضحاکؓ کو قبیلہ قرطا– جو بنی بکر کی ایک شاخ تھا– کی بت پرست منفی قوتوں کے مقابلے کے لیے بھیجا جو اسلام سے دشمنی اور بت پرستی کو شعار بنائے ہوئے تھا۔ اس کی قوت توڑنے کے لیے آپؓ کو ایک فوجی دستے کا کمانڈر بنا کر بھیجا گیا، جو کئی جانبازوں پر مشتمل تھا اور اس اجتماعیت دشمن رجعت پسند قوت کا صفایا کر کے فاتحانہ واپس آیا۔ یہ سریہ ضحاک بن سفیان کے نام سے تاریخ میں موسوم ہے۔ حضرت ضحاکؓ بنیادی طور پر ایک مجاہد تھے اور زندگی کا زیادہ تر حصہ جہادی اسفار اور غلبہ دین کے مشاغل اور جدوجہد میں گزرا۔ حضرت عمرؓ، آپؓ کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے۔

حضرت ضحاکؓ ان لوگوں میں بھی شامل ہیں، جن سے رسول اللہ ﷺ کی احادیث روایت کی گئیں۔ چناں چہ آپ سے 4 احادیث مروی ہیں۔ تابعین میں سے حضرت سعید بن میبؒ اور اولیاء اللہ کے سرتاج حضرت حسن بصریؒ نے آپؓ سے احادیث روایت کی ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ کے دورِ خلافت میں جن عرب قبائل نے ارتداد اختیار کیا اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کا راستہ اختیار کیا، ان میں سے "بنو قراب" بھی تھے تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کی سرکوبی کے لیے حضرت ضحاکؓ کو بھیجا۔ جب آپؓ ان کے مقابلے میں پہنچے تو دیکھا کہ مرتدین بہت بڑی تعداد میں تھے۔ حضرت ضحاکؓ ان کے ساتھ بڑی بہادری سے لڑے۔ زبردست جنگ ہوئی اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے، تاہم حضرت ضحاکؓ کا خون رائیگاں نہیں گیا۔ بعد ازاں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہٗ کو روانہ کیا گیا۔ انھوں نے اس قوت کو شکستِ فاش دی۔

(ماخوذ: اسد الغابہ، غزوہ تبوک احمد باشمیل)

شذرات

آزادی، گمشدہ قیادت اور برِ عظیم کا مستقبل

اگست کا مہینہ برِ عظیم پاک و ہند اور بنگلا دیش کی تاریخ میں انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ یہی وہ مہینہ ہے، جس میں برطانوی سامراج کی تقریباً دوسو سالہ حکمرانی کا رسمی خاتمہ ہوا، آزادی کا سورج طلوع ہوا اور اس خطے کو دو آزاد، خودمختار جمہوری ریاستوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ محض اقتدار کی منتقلی نہیں تھی، بلکہ ایک ایسا تاریخی انقلاب تھا، جس نے کروڑوں انسانوں کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ تاہم آزادی کے آٹھ دہائیوں پر محیط طویل عرصے کے بعد بھی یہ سوال اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہے کہ: کیا اس خطے نے حقیقی آزادی کے تقاضوں کو سمجھا؟ اور کیا اس کے حقیقی ثمرات حاصل کر پائے؟

آج برِ عظیم؛ پاک و ہند و بنگلا دیش‘ سیاسی بے چینی، معاشی بحران، سماجی انتشار، داخلی عدمِ استحکام، لسانی کشیدگی، نسلی تعصّبات، مذہبی منافرت اور باہمی بداعتمادی جیسے سنگین چیلنجوں سے دوچار ہے۔ یہ بحران محض کسی ایک حکومت یا نسل کا مرہونِ منت نہیں، بلکہ اس کی جڑیں اُس سامراجی نظام میں پیوست ہیں جس نے دو صدیوں تک ”تقسیم کرو اور حکومت کرو“، نفرت پھیلانے اور فکری غلامی کی پالیسی کے ذریعے اپنی گرفت مضبوط کی۔ آزادی کے بعد اگرچہ اقتدار مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں آ گیا، مگر سامراج کے بوئے ہوئے زہریلے بیج آج بھی ریاستی اداروں، سیاسی رویوں، تعلیمی نظام، معیشت اور معاشرتی رجحانات میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔

امامِ انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے طویل جلاوطنی کے بعد وطن واپسی پر جس دکھ اور کرب کا اظہار کیا، وہ آج بھی ہمارے لیے ایک روشن آئینہ ہے۔ آپؒ نے فرمایا: ”جب مَیں ہندوستان واپس آیا تو مجھے شدید حیرت اور رنج ہوا کہ آزادی کا چراغ تو ہر طرف روشن ہے، مگر اُس عظیم تحریک کا کہیں ذکر نہیں جس نے اس خطے میں غلامی کے خلاف شعور بیدار کیا۔ مزاحمت کی بنیاد رکھی اور برطانوی سامراج کے سامنے جھکنے سے انکار کیا۔ ہر طرف کانگریس اور مسلم لیگ کا تذکرہ تھا، لیکن اُس فکری و انقلابی تحریک کو فراموش کر دیا گیا تھا“۔

یہ وہی تحریک تھی، جس کی بنیاد حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے رکھی اور جسے حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، حضرت سیّد احمد شہیدؒ، حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ، حضرت مولانا عبدالحئی بڈھانویؒ، حضرت مولانا محمد اسحاق دہلویؒ، حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلویؒ اور حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ ایسی عظیم ہستیوں نے اپنی بے مثال قربانیوں سے آگے بڑھایا۔ یہی وہ تحریک تھی، جس نے آزادی کو محض اقتدار کی تبدیلی نہیں، بلکہ انسان کی فکری، سیاسی، معاشی اور تہذیبی آزادی کے طور پر متعارف کرایا۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد جب انگریز کی بربریت عروج پر تھی، انھیں عظیم شخصیات نے آزادی کے چراغ کو بجھنے نہ دیا۔ پھانسیوں، جلاوطنی، قید و بند اور جائیدادوں کی ضبطی کے باوجود انھوں نے مزاحمت کا پرچم بلند رکھا اور آنے والی نسلوں تک حریت کا پیغام پہنچایا۔

بدقسمتی سے، آزادی کے بعد اس فکری روایت کو قومی شعور سے تقریباً خارج کر دیا گیا۔ نتیجتاً نئی نسل اپنی حقیقی فکری اور سیاسی میراث سے ناآشنا ہوگئی۔ جب کوئی قوم اپنی اصل رہنما فکری قیادت کو فراموش کر دیتی ہے تو قیادت کا خلا اُن طبقات سے پُر ہوتا ہے، جن کی ذہنی ساخت سامراجی تعلیم و تربیت سے ڈھلی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اقتدار تو سنبھال لیتے ہیں، مگر قوم کے بنیادی مسائل کو سمجھنے، ان کا مستقل حل تلاش کرنے اور خودمختار قومی پالیسی بنانے کی صلاحیت سے محروم رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے باوجود ہماری سیاست، معیشت، تعلیم اور خارجہ پالیسی پر سامراجی اثرات آج بھی غالب ہیں۔

حقیقی آزادی صرف جغرافیائی آزادی کا نام نہیں، بلکہ آزاد فکر، قومی خوداعتمادی، تہذیبی شعور، اپنے وسائل پر انحصار اور اجتماعی وقار کا نام ہے۔ جو قومیں اپنی فکری بنیادوں پر مضبوطی سے کھڑی ہوتی ہیں، وہ شدید ترین آزمائشوں میں بھی اپنا استقلال اور خودداری برقرار رکھتی ہیں۔ اس حقیقت کی ایک روشن مثال معاصر دور میں اسلامی جمہوریہ ایران ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں کے دوران شدید پابندیوں، سفارتی تنہائی، معاشی دباؤ اور عسکری خطرات کے باوجود ایران نے داخلی وسائل، سائنسی ترقی، قومی خوداعتمادی اور نظریاتی استقامت کو اپنا قومی سہارا بنایا۔ حالیہ واقعات نے ایک بار پھر ثابت کیا کہ قومی خوداعتمادی اور نظریاتی استقلال کسی قوم کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتا ہے۔ شہید رہبر کی تدفین کے موقع پر دنیا بھر کے اسّی سے زائد ممالک کے اعلیٰ سطحی وفود کی شرکت اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ ایران کو تنہا کرنے کی حکمتِ عملی ناکام ہو چکی ہے۔ اس مثال کا مقصد کسی مخصوص نظام کی تقلید نہیں، بلکہ اس حقیقت کو اُجاگر کرنا ہے کہ حقیقی آزادی کی روح خود اِنحصاری، فکری استقلال اور قومی اعتماد میں پنہاں ہے۔ جو قومیں اپنی تاریخ، تہذیب، نظریے اور اصل قیادت پر اعتماد رکھتی ہیں، وہی اپنا مستقبل خود تعین کرتی ہیں۔

آج برِ عظیم کے لوگوں کو اپنی آزادی کی تاریخ کو ازسرِنو پڑھنے کی اشد ضرورت ہے۔ آزادی کو صرف 1947ء کے ایک سیاسی واقعے کے طور پر نہیں، بلکہ اس طویل فکری، دینی، سیاسی اور انقلابی جدوجہد کے تناظر میں دیکھنا چاہیے، جس کی بنیاد امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے رکھی اور بعد کے قومی اکابر نے اپنی عظیم قربانیوں سے پروان چڑھایا۔

اگر ہم اپنے مسائل کا پائیدار حل چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی حقیقی فکری میراث سے دوبارہ جڑنا ہوگا، قیادت کے معیار کو ازسرِنو متعین کرنا ہوگا اور اُن رجالِ کار کو آگے لانا ہوگا جو سامراجی فکر کے بجائے اس خطے کی دینی، تہذیبی اور تاریخی بنیادوں سے وابستہ ہوں۔ یہی واحد راستہ ہے جو قومی خوداعتمادی، سیاسی استحکام، معاشی خودکفالت اور اجتماعی عزت کی طرف لے جاتا ہے۔

(بقیہ: صفحہ 12 پر)

''نفس'' سے متعلق ''مقامات'' (3)

مترجم: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ ''حُجّةُ اللّٰہِ البالِغہ'' میں فرماتے ہیں:

(4۔ فضول چیزوں کو چھوڑ دینا)

''جب حقیقی طور پر ورع اور پرہیزگاری کا ''مقام'' پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ایمانی نور بھی اُتر کر قلبی جبلت کے ساتھ مخلوط ہو جاتا ہے تو اُس کے نفس میں ضرورت سے زائد چیزوں میں (علمی اور عملی طور پر) مشغول ہونے کی بُرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ نفس پر فضول کاموں کی طرف جانے کا راستہ روک دیتا ہے اور نورِ ایمانی، نفس تک سرایت کر جاتا ہے اور وہ اُس کو غیر ضروری چیزوں کی طلب سے روک دیتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ:

''مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُه ما لا يعنيه'' (مشکوٰۃ، حدیث: 4839)

(کسی آدمی کے اسلام کا حسن یہ ہے کہ وہ لایعنی کاموں سے اُسے روک دے)۔

مَیں کہتا ہوں کہ: اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی بھی چیز میں مشغولیت، انسانی نفس کے آئینے پر ایک سیاہ دھبہ ہے۔ سوائے اُن چیزوں کے – جو اُس کی زندگی گزارنے کے لیے ضروری اور کفایت کرنے والی ہیں – وہ معاف ہیں۔ اس کے سوا نورِ ایمانی کا واعظ ہر مسلمان کے دل میں یہ حکم دیتا ہے کہ وہ ایسی چیزوں سے باز رہے۔

(زہد کی حقیقت؛ احادیث کی روشنی میں)

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ: ''دنیا سے بے رغبتی، حلال کو حرام کرنے اور مال ضائع کرنے کا نام نہیں، بلکہ دنیا سے بے رغبتی یہ ہے کہ جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے وہ اس چیز سے، جو اللہ کے ہاتھوں میں ہے، زیادہ قابلِ اعتماد نہ ہو، اور یہ کہ دنیا میں جو مصیبت تم پر آئے تو تم اس پر زیادہ خوش ہو، بہ نسبت اس کے کہ مصیبت نہ آئے ور آخرت کے لیے باقی رکھی جائے''۔ (مشکوٰۃ، حدیث: 5301)

مَیں کہتا ہوں کہ: کبھی دنیا میں زاہد آدمی پر زہد کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ جو اُسے ایسے عقائد اور افعال پر اُبھارتا ہے، جو شریعت میں پسندیدہ نہیں ہوتے۔ اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے یہ بیان کر دیا ہے کہ زہد کے دائرے میں کون سی چیز شریعت میں پسندیدہ ہے اور کون سی چیز غیر پسندیدہ ہے۔ پس جب زہد اختیار کرنے والے آدمی پر ضرورت سے زائد چیزوں میں مشغول ہونے کی خرابی ظاہر ہو جاتی ہے تو وہ ان غیر ضروری چیزوں کو اسی طرح ناپسند کرتا ہے، جیسے وہ طبعی طور پر ضرررساں چیزوں کو ناپسند کرتا ہے۔ پھر:

(اَ) بسا اوقات زہد کی یہ حالت اُس کو اس سلسلے میں انتہا پسندی تک پہنچا دیتی ہے تو وہ ظاہرِ شریعت میں بھی اللہ کے مؤاخذے کا اعتقاد رکھنے لگتا ہے (حال آں کہ فی نفسہٖ وہ جائز ہوتی ہیں)۔ ایسا اعتقاد رکھنا بالکل باطل عقیدہ ہے۔ اس لیے کہ شریعت بشری طبیعتوں کے دستور کے مطابق نازل ہوئی ہے اور زہد ایک قسم کا انسانی طبعی تقاضوں سے دور رہنا ہے۔ یہ اللہ کا خاص حکم اُس کے نفس کے مجاہدے کے بارے میں ہے، تاکہ نفس کے مقام کی تکمیل ہو جائے۔ یہ کوئی شرعی طور پر اُسے مکلّف اور پابند بنانا نہیں ہے۔

(ب) اور بسا اوقات یہ زہد اور طبعی ناپسندیدگی اُس کے مال کے ضائع کرنے تک پہنچا دیتی ہے اور وہ اپنے مال کو دریاؤں میں ڈالنے اور پہاڑوں پر پھینکنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ زہد کا ایک ایسا غلبہ ہے کہ شریعت اس کو صحیح نہیں سمجھتی۔ اور یہ زہد کے احکامات کے ظہور کے حوالے سے غیر معتبر ہے۔

بلکہ شریعت زہد کے احکامات کو ظاہر کرنے میں دو چیزوں کا اعتبار کرتی ہے:

(1) ضرورت سے زائد چیزیں جو ابھی حاصل نہیں ہوئیں، تو ایسی چیزوں کی طلب میں تکلف سے کام نہ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے کہ اللہ نے دنیا میں اُس چیز کے ملنے اور آخرت میں ثواب کا جو اس سے وعدہ کیا ہے، وہ ضرور پورا ہوگا۔

(2) جو چیزیں اُس کے ہاتھ سے چلی جائیں تو اپنے نفس کو اُن کے پیچھے نہ لگائے اور اُس پر افسوس کا اظہار نہ کرے۔ ایمان کی ایسی حالت پر برقرار رہتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں اور فقرا کے ساتھ وعدہ کیا ہے۔

(مجاہدے کی اہمیت اور ضرورت)

جاننا چاہیے کہ انسانی نفس فطری طور پر شہوات کے پیچھے لگنے پر پیدا کیا گیا ہے۔ انسان ہمیشہ اس حالت پر رہتا ہے، سوائے اس کے کہ نورِ ایمان اُس پر غالب آ جائے اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کا وہ قول ہے (قرآن حکیم میں ہے کہ):

''وَمَآ أُبَرِّئُ نَفْسِيٓۚ إِنَّ ٱلنَّفْسَ لَأَمَّارَةٌۢ بِٱلسُّوٓءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيٓۚ''

(12-یوسف: 53) (میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا، اس لیے کہ نفس بُرائیوں کا حکم دیتا رہتا ہے، سوائے اس کے، جس پر میرے رب نے رحم کیا)۔

پس ایک مؤمن اپنی پوری زندگی اللہ کے نور کو اپنے نفس میں اُتارنے کے لیے نفس سے مجاہدے میں رہتا ہے۔ پس جب بھی اُس کے اندر نفسانی تقاضا اور داعیہ جوش مارتا ہے تو وہ اللہ کی طرف پناہ لیتا ہے اور اللہ کی جلالتِ شان، اُس کی عظمت، اللہ نے فرماں برداروں کے لیے ثواب کا جو وعدہ کیا ہے اور نافرمانوں کے لیے جو عذاب مقرر کیا ہے، ان سب کو یاد کرتا ہے تو اُس کے دل اور عقل سے ایک حقانی خیال جوش مارتا ہے، جو باطل خیال کا سر کچل کر رکھ دیتا ہے۔ پس وہ نفسانی جذبہ ایسے ہو جاتا ہے، گویا کہ اُس کا کوئی ذکر ہی نہیں، سوائے اس کے (کہ اس کیفیت میں) جو ایک عارف باللہ اور ابتدائی سالک کے درمیان جو فرق ہوتا ہے، وہ تھوڑا نہیں ہے (بلکہ زیادہ ہے کہ مبتدی کو اس کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے)''۔ (أبواب الإحسان، باب: 4، المقامات والأحوال)

مفتی محمد اشرف عاطف، لاہور

عثمانی سلطنت کے نویں حکمران؛

سلطان سلیم اوّل

سلطان بایزید ثانی کے تین لڑکے تھے، جو ایشیائے کوچک کے مختلف صوبوں کے حکمران تھے۔ کورکود بڑا لڑکا تھا، دوسرے نمبر پر احمد اور تیسرا سلیم تھا۔ بایزید اپنے منجھلے لڑکے احمد کو سب سے زیادہ پسند کرتا تھا اور اس کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا، لیکن سلیم جو سب سے چھوٹا تھا، وہ اپنی بہادری اور شجاعت کی وجہ سے فوج میں مقبول تھا۔

اُدھر سلطان بایزید ثانی خرابیٔ صحت کی وجہ سے امورِ سلطنت کی طرف توجہ نہیں دے پا رہے تھے تو سلیم نے محسوس کیا کہ والدِ محترم اس صورتِ حال میں کہیں منجھلے بھائی احمد کو تخت پر نہ بٹھادیں۔ اس خدشے کے پیشِ نظر وہ سلطان کی اجازت کے بغیر اپنے گورنری کے مقام سے منتخب فوج لے کر قسطنطنیہ کی طرف چل پڑا۔ سلطان بایزید نے اس کو واپس جانے کے لیے کہا، لیکن سلیم جنگ پر آمادہ ہوگیا۔ سلطان کو مجبوراً اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ جنگ میں سلیم کو شکست ہوگئی تو وہ بھاگ کر کریمیا چلا گیا۔ کریمیا کا گورنر سلیم کا سسر تھا۔ اس نے سلیم کی مدد کی اور وہ پھر منظم ہو کر قسطنطنیہ آیا۔ اب کی بار فوج نے بھی اس کی حمایت کی۔

اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے سلطان نے فوج سے مذاکرات کیے اور ان سے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ: ہمارا سلطان ضعیف اور کمزور ہوگیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ شہزادہ سلیم کو تختِ سلطنت پر بٹھایا جائے۔ جب سلطان بایزید نے فوج کے یہ تیور دیکھے کہ فوج قابو سے باہر ہوچکی ہے تو سلطان بایزید ثانی؛ شہزادہ سلیم کے حق میں تخت سے دست بردار ہوگئے۔ اس طرح شہزادہ سلیم سلطانی کے منصب پر تخت نشین ہوئے۔ سلطان سلیم کی عمر اس وقت تقریباً سینتالیس سال تھی۔ اس کی فوجی مہارت اور انتظامی صلاحیت پوری طرح تسلیم شدہ تھی۔ اس نے صرف آٹھ سال کے مختصر عرصے میں سلطنتِ عثمانیہ کی وسعت کو دو چند کردیا۔ ایشیا میں شام، مصر، عرب، کردستان کو فتح کر کے سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کرلیا۔ حرمین شریفین بھی سلطان سلیم کے دَور میں سلطنتِ عثمانیہ کا حصہ بنے۔

سلطان سلیم کی فتوحات کی وسعت اور اعلیٰ انتظامی و فوجی صلاحیت و مہارت نے اس کو عثمانی سلاطین کی صف میں ممتاز مقام عطا کردیا۔ ان صلاحیتوں کے علاوہ علم و فضل میں بھی اس کا مرتبہ نہایت بلند تھا۔ وہ رات کو زیادہ تر وقت کتابوں کا مطالعہ کرتا۔ اس کو تاریخ اور فارسی شاعری سے خاصی دلچسپی تھی۔ وہ خود بھی شاعر تھا۔ فارسی زبان میں اس نے کچھ نظمیں بھی کہی تھیں۔ اپنے جدِامجد سلطان محمد فاتح کی طرح وہ بھی سیزر اور سکندر کے کارنامے نہایت شوق سے پڑھتا تھا۔ اس کو گھریلو زندگی سے بہت کم دلچسپی تھی۔ دن میں سلطنت کے امور سے وقت بچتا تو وہ اہلِ علم کی صحبت میں گزارتا۔

وہ اصحابِ علم کا بڑا قدردان تھا۔ اس نے علما و فضلا کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا تھا۔ علما کی ہم نشینی کے باوجود اس کے مزاج کی سختی کم نہ ہوئی۔ اس کی طبیعت بہت زیادہ اشتعال پذیر تھی۔ وہ اختلافِ رائے کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کی یہ بہت بڑی کمزوری تھی، تاہم اس کی طبیعت کی سختی ایک خاص اصول کے ماتحت تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ سلطنت کے امور کو منضبط طریقے سے چلانا نہایت ضروری ہے اور انتظامی امور میں نظم و ضبط کے قیام میں بھی سختی نہایت ضروری ہے۔

ان کے والد کے دورِ حکومت کے آخری سالوں میں ان کی طبیعت کی نرمی کی وجہ سے جو امورِ مملکت کے نظم میں اَبتری و بگاڑ پیدا ہوگیا تھا، تمام شعبے بدنظمی کا شکار تھے۔ فوج خودسر ہوگئی تھی۔ قاضیوں کے فیصلوں میں جانب داری کی جھلک نمایاں تھی۔ وزرا اور حکومت کے دیگر کارندے اپنے فرائض سے غافل ہو رہے تھے۔ ایسے میں حکومتی شعبوں کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے مناسب سختی ناگزیر تھی۔ اس صورتِ حال میں بعض دفعہ سزا کی شدت جرم کی شدت سے بڑھ جاتی ہے۔ تاہم اس سختی کا عام اَثر نہایت مفید ہوا اور وہ تمام خرابیاں دُور ہوگئیں، جن سے حکومت کی بنیادیں متزلزل ہوتی ہیں۔ اس سختی کی وجہ سے بعض مؤرخین نے سلطان سلیم اوّل کو 'ظالم' تک کہا ہے، لیکن وہ رعایا میں بہت زیادہ مقبول تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا وہ عمل جو خاص اور کرپٹ لوگوں کے لیے ظلم تھا، وہ عام لوگوں کے حق میں انصاف اور رحمت بن گیا۔

سلیم نے جب دیکھا کہ سلطنت میں استحکام آگیا ہے تو اس نے یورپ کا رُخ کیا اور یورپ کی مختلف حکومتوں سے صلح ناموں کی تجدید کی اور اس طرح اس نے سلطنت کے مغربی حصے کو بیرونی خطرات سے محفوظ کرلیا۔ مشرق میں ایران پر اس وقت شاہ اسماعیل صفوی کی حکومت تھی۔ جس نے چند سال قبل عراق، خراسان اور دیارِ بکر (جنوب مشرقی ترکی کے بالائی علاقے) پر قبضہ کرلیا تھا اور 1510ء میں اس نے آذربائیجان کو بھی ایرانی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اس طرح ایرانی اور عثمانی سلطنتوں کی سرحدیں باہم متصل ہوگئی تھیں۔ اتفاق یہ کہ دونوں سلطنتوں کے حکمران شجاعت اور اپنی سلطنت کو وسیع تر کرنے میں برابر رہے، اس وجہ سے فوجوں کے درمیان تصادم کا ہونا ناگزیر تھا جو کہ بعد میں ہوا، جس کے متعدد اسباب تھے۔ سب سے بڑا سبب تو عقیدے کا اختلاف تھا۔

تصادُم کا آغاز اس طرح سے ہوا کہ شاہ اسماعیل صفوی نے چند جاسوس بھیج کر اناطولیہ میں سلطان سلیم کے خلاف رعایا کو بھڑکانا شروع کردیا اور رعایا کو بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اس پر سلطان سلیم نے سب سے پہلے تو ان جاسوسوں کا کھوج لگایا اور ان کے سہولت کاروں کو گرفتار کر کے کیفرِ کردار تک پہنچایا۔

سلطان سلیم جیسا تندمزاج حکمران ایسے اقدامات کو کہاں برداشت کرسکتا تھا۔ چناں چہ اس نے ایران پر حملہ کرنے کا ارادہ کرلیا اور شاہ اسماعیل کو مقابلے کی دعوت دی۔ حملہ کرنے کی غرض سے 20/ اپریل 1514ء کو ایک لاکھ بیالیس ہزار پر مشتمل فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ ایران کے دارالحکومت تبریز پر حملہ کردیا۔ (بقیہ: صفحہ 12 پر)

رپورٹ: سیّد نفیس مبارک ہمدانی، لاہور

قرآن حکیم؛ فکر، تدبر، تفقہ اور بصیرت کی کتاب

یکم؍ اگست 2025ء کو حضرت اقدس مولانا مفتی شاہ عبدالخالق آزاد رائے پوری مدظلہ نے ادارہ رحیمیہ لاہور میں خطبہ جمعہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

’’قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کی وہ عظیم اور لازوال کتاب ہے جو قیامت تک انسانیت کی رہنمائی اور تمام اجتماعی و انفرادی مسائل کے حل کے لیے ایک واضح لائحۂ عمل پیش کرتی ہے۔ یہ صرف تلاوت کی کتاب نہیں بلکہ فکر، تدبر، تفقہ اور بصیرت کی کتاب ہے۔ جو شخص دل کے کانوں سے اسے سنتا، دل کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتا اور اس کے مضامین میں غور و فکر کرتا ہے، اس کے لیے قرآن عقل و شعور کے نئے دروازے کھول دیتا ہے، دلوں پر چڑھے ہوئے زنگ آلود غلاف دور کرتا ہے اور زندگی کے پیچیدہ مسائل کا راستہ دکھاتا ہے۔ اس کے برعکس جن لوگوں کے دل غفلت میں مبتلا ہوں، جو سننے، سمجھنے اور حقیقت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوں، ان کے لیے قرآن محض تلاوت، خوش الحانی اور ایک رسمی عبادت بن کر رہ جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے امت کو اسی خطرے سے آگاہ فرمایا تھا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا جب قرآن خوب صورت آوازوں میں پڑھا جائے گا، اس کی تفسیریں بیان ہوں گی اور اس کے احکام بھی نوکِ زبان پر ہوں گے، لیکن وہ دلوں میں اتر کر کردار، فکر اور اجتماعی زندگی کو تبدیل نہیں کرے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ قرآن پڑھنے والے بھی انھی گمراہیوں اور فتنوں میں مبتلا ہوں گے جن میں وہ لوگ مبتلا ہوئے تھے، جنھوں نے اپنی آسمانی کتابوں کو محض رسم بنا لیا تھا۔ یہی صورتِ حال یہودیوں اور عیسائیوں کی تھی۔ ان کے پاس تورات اور انجیل موجود تھیں، ان کے علما اور حفاظ بھی تھے، ان کے مدارس اور عبادت گاہیں بھی آباد تھیں، مگر چوں کہ انھوں نے اپنی کتابوں کی حقیقی رہنمائی کو چھوڑ دیا تھا، اس لیے وہ حق کے مقابلے میں ناکام ہوتے گئے۔

آج مسلمانوں کی مجموعی حالت بھی اسی سے مشابہ ہے۔ مدارس، جامعات، مساجد اور خانقاہیں موجود ہیں، قرآن کی بہترین تلاوت بھی ہوتی ہے، لیکن قرآن سے عقل و شعور، بصیرت، قومی فکر اور مسائل کے حل کی رہنمائی حاصل کرنے کی طرف توجہ کم ہے۔ جب تک قرآن کو صرف ثواب یا رسم کی کتاب سمجھا جاتا رہے گا، اس وقت تک امت اپنے اجتماعی مسائل سے نجات حاصل نہیں کرسکتی۔

رسول اللہ ﷺ نے تیرہ سال تک قرآن کی آیات کے ذریعے اہلِ مکہ کے دلوں پر دستک دی، ان کے باطل تصورات کو چیلنج کیا، ان کی سوچ کو بدلا اور انھیں عقل و شعور کے ساتھ اپنے قومی مستقبل پر غور کرنے کی دعوت دی۔ چناں چہ آپ ﷺ نے ایک ایسی جماعت تیار کی جس کے افراد گو تعداد میں کم تھے، لیکن ان کے دل ایمان، تفقہ، بصیرت، جرأت اور عزم سے بھرپور تھے۔ وہ عالمی حالات کو سمجھنے والے، وسائل کا صحیح فہم رکھنے والے اور اپنی قوم کی عزت، طاقت اور قیادت کے لیے تیار کیے گئے تھے‘‘۔

قرآن حکیم کی تعلیم؛ قومی انقلاب، سیاسی استحکام اور حقیقی عزت

حضرت آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے مزید فرمایا:

’’حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے مطابق سیرتِ نبوی ﷺ کے مکی دور کا مطالعہ یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ اس زمانے میں مکہ کا حکمران طبقہ اپنی مستقل قومی شناخت سے محروم ہو چکا تھا۔ وہ اپنی سیاسی قوت اور فکری آزادی کے بجائے دو بڑی عالمی طاقتوں، قیصرِ روم اور کسریٰ ایران کے اثر و نفوذ میں زندگی گزار رہا تھا۔ قریش کے مختلف گروہ انھیں طاقتوں کے مفادات کے مطابق اپنے تعلقات استوار کرتے تھے، کبھی روم کے حامی بن جاتے اور کبھی ایران کے نمائندے۔

رسول اللہ ﷺ نے اسی ماحول میں اہلِ مکہ کو جھنجھوڑا اور انھیں ان کی اصل پہچان یاد دلائی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہو، اس لیے تمھاری نسبت ان عالمی طاقتوں سے نہیں، بلکہ اس عظیم ابراہیمی مشن سے ہونی چاہیے جس کا مقصد پوری انسانیت کی رہنمائی تھا۔ قیصر و کسریٰ اپنی اصل تعلیمات سے منحرف ہو چکے تھے اور محض اقتدار، مفادات اور سیاسی غلبے کے اسیر بن گئے تھے۔ اگر قریش بھی انھیں کے تابع رہیں گے تو وہ اپنی تاریخی ذمہ داری اور قومی وقار دونوں سے محروم ہو جائیں گے۔ قرآن نے انھیں ملتِ ابراہیم کی طرف رجوع کرنے، اپنی عزت بحال کرنے اور انسانیت کی خدمت کا کردار اختیار کرنے کی دعوت دی۔

رسول اللہ ﷺ نے قریش کو متوجہ کیا کہ وہ اپنے قریب کے آباء و اجداد پر فخر کرنے کے بجائے اپنے سب سے بڑے جدِامجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت اور مشن کو اختیار کریں۔ جس شخصیت نے خانۂ کعبہ کو توحید کا مرکز بنایا، اس کی تعلیمات کو چھوڑ کر عمرو بن لُحی جیسے افراد کی شرک و بدعات کو اختیار کرنا قومی زوال کی علامت ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ قوم اپنی اصل بنیادوں کی طرف لوٹے، اپنی سیاسی طاقت خود پیدا کرے، اپنی معاشی قوت اپنے وسائل سے استوار کرے اور دوسروں کے سہارے یا عالمی طاقتوں کی ایجنٹی کو اپنی بقا کا ذریعہ نہ سمجھے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مطابق مکی دور میں رسول اللہ ﷺ کی پوری دعوت کا مقصد مسلمانوں کے اندر توحیدِ الٰہی کے ساتھ قومی شعور، سیاسی بصیرت اور اجتماعی ذمہ داری پیدا کرنا تھا۔ آپ ﷺ نے صرف افراد کی اصلاح نہیں کی، بلکہ ایک ایسی جماعت تیار کی جو عرب کے مختلف قبائل میں فکری بیداری پیدا کرتی رہی۔ بنو غفار، بنو اسلم، بنو جہینہ اور مزینہ جیسے قبائل کے باشعور افراد بھی اس دعوت سے متأثر ہوئے اور ایک نئے اجتماعی نظم کا حصہ بنتے گئے۔ یہی شعور آگے چل کر مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کا سبب بنا، جہاں رسول اللہ ﷺ نے سیاسی قیادت سنبھالی اور ایک خودمختار، باوقار اور منظّم قوم اور ریاست کی بنیاد رکھ دی۔ اس طرح قرآنِ حکیم یہ تعلیم دیتا ہے کہ قومی انقلاب، سیاسی استحکام اور حقیقی عزت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب قوم اپنی اصل شناخت، اپنے نظریے اور اپنے اجتماعی مقصد کو پہچان کر اس کے مطابق اپنی قوت کو منظّم کرے‘‘۔

انبیا علیہم السلام کے سچے وارثین کی قومی سیاسی جدوجہد

حضرت آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے مزید فرمایا:

”بعثتِ نبوی ﷺ کے وقت مکے والے تین سو سال سے غلام تھے اور نبی اکرم ﷺ قومی وقار اور آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ مصر میں بھی بنی اسرائیل صدیوں سے غلام تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی آزادی اور نجات کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ یہی منظرنامہ برعظیم میں بھی نظر آتا ہے، جہاں تقریباً تین سو سال سے ظالم طاقتوں کا تسلط قائم رہا۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ظلم و ستم سے شروع ہونے والا یہ دور اس خطے کی غلامی اور قومی وقار کی پامالی کی تاریخ بن کر رہ گیا۔

انبیا علیہم السلام کے بعد ان کے سچے وارثین نے بھی عقل و شعور اور فہم و بصیرت کی بنیاد پر آزادی کی جنگ لڑی اور قومی وقار کو بلند کرنے کی جدوجہد کی۔ مجدد الف ثانیؒ کی سیاسی و معاشی جدوجہد، امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی سیاسی تحریک، صوفیا، اولیا، علمائے ربانیین اور سچے رہنماؤں کی دعوتِ حق اسی احساس پر قائم تھی۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں پر غلاف چڑھ گئے تھے اور جن کے دماغوں میں غلامی کی سوچ رچ بس گئی تھی، ان کے مقابلے میں ولی اللّٰہی اور مجددی جماعت نے قرآن کے اس اُصول پر ڈٹ کر کہا: ”اگر تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے! میرے لیے میرا کام اور تمھارے لیے تمھارا کام“۔ (10-یونس: 41)

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جب ہندوستان میں دینی تجدیدی کردار ادا کیا تو حکمرانوں، بڑے پیروں، علما اور بااثر لوگوں نے ان کے خلاف فتوے لگائے، لیکن انھوں نے اسی اصول پر ثابت قدم رہ کر اپنا کام جاری رکھا۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی یہی تجدیدی کردار ادا کیا۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھائی، قومی شناخت کی حفاظت کی، انگریزوں کے مظالم کے خلاف جدوجہد کی۔ امام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے فتوائے آزادی، حضرت سیّد احمد شہیدؒ، حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کی قربانیاں اور 1857ء کے مجاہدینِ آزادی، تحریکِ ریشمی رومال، دارالعلوم دیوبند اور علمائے ہند کی پوری تاریخ اسی قرآنی اُصول: ”میرے لیے میرا کام اور تمھارے لیے تمھارا کام“ کی عملی تفسیر ہے۔

دوسری طرف ایسے لوگ بھی رہے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ”ان میں بعض ایسے ہیں کہ تمھاری طرف کان لگاتے ہیں“ (10-یونس: 42) وہ مجاہدینِ آزادی سے نسبت کے دعوے تو کرتے ہیں، لیکن آزادی کا جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنے دل اور دماغ گروی رکھ دیے، غلامی کو فروغ دیا اور اسلام کے نام پر قومی آزادی سلب ہونے دی، وہ کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ آج تین سو سالہ غلامی اور 78 سالہ ’آزادی‘ کے بعد بھی اگر ہم مظلوم ہیں تو ہمیں اپنے اعمال دیکھنے ہوں گے کہ ہم نے عقل مندوں کی بات مانی یا انھیں جھٹلایا اور ان کی تکذیب کی؟ شیخ الہندؒ، مولانا مدنیؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، شاہ ولی اللہؒ، مجدد الف ثانیؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ جیسے مخلص رہنماؤں کی دعوت کو جھٹلانے کا نتیجہ آج بھی ہماری قومی زندگی میں نمایاں نظر آتا ہے“۔

ماہِ اگست؛ مصنوعی آزادی کے بجائے غلامی کو سمجھنے کا مہینہ

حضرت آزاد رائے پوری مدظلہٗ نے مزید فرمایا:

”اگست کا مہینہ عقل و شعور کے ساتھ ان مظالم کو سمجھنے کا ہے جو دنیا کی ظالمانہ طاقتوں نے خصوصاً ایشیائی اقوام، افریقا کے کالوں، مشرقِ وسطیٰ اور فلسطینیوں پر ڈھائے ہیں۔ فلسطینیوں پر مظالم تو ڈیکلیئرڈ ہیں، اور اگر کوئی اس کے باوجود بھی ظالم کو ظالم نہیں مانتا تو اس کی حالت وہی ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ”کیا تم اندھوں کو راہ دکھا دو گے اگر کچھ بھی نہ دیکھتے ہوں“ (10-یونس: 43)۔ وہ دل کا اندھا اور عقل کا بہرا ہے۔ جب عقل ہی نہ رہے تو دیکھنا اور سننا بے فائدہ ہو جاتا ہے۔ آج ہمارا حکمران طبقہ بھی عقل سے فارغ اور اندھا ہو چکا ہے۔ یاد رکھو! ظالم کی معاونت کرنے والا، اگر اپنے اس ظلم سے توبہ نہ کرے، تو قرآن کے مطابق دنیا اور آخرت دونوں کے جہنم کا مستحق ہے، کیوں کہ وہ ظالم کا آلہ کار اور ایجنٹ ہے۔

اگست کا یہ مہینہ مصنوعی آزادی منانے کا نہیں، بلکہ غلامی کو سمجھنے کا مہینہ ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے 1941ء میں فرمایا تھا کہ (تقسیمِ ہند کی) جو سکیم بنائی جا رہی ہے، اس کے نتیجے میں پہلے افغانستان اور پھر اسلام کے نام پر بننے والا ملک تباہ و برباد ہوگا۔ انھوں نے کھلی آنکھوں، بیدار دل اور زندہ عقل سے یہ نتائج دیکھ لیے تھے، لیکن جن کی آنکھیں اندھی اور کان بہرے تھے، وہ نہ سمجھ سکے۔ آج برٹش لائبریری سے سامنے آنے والے پارٹیشن آف انڈیا کے ڈاکومنٹس بھی بتا رہے ہیں کہ اس خطے کی قومیت اور اجتماعیت کو تقسیم کر کے ”ڈیوائیڈ اینڈ رول“ کی سیاست کی گئی اور یہ کھیل گزشتہ اسّی برس سے جاری ہے۔

دنیا کی ظالم طاقتیں ہمیشہ اپنے مفادات کے مطابق پالیسیاں بدلتی رہتی ہیں۔ کبھی ایک ملک کو آگے بڑھایا جاتا ہے اور کبھی دوسرے کو دبایا جاتا ہے۔ ایک وقت میں ”برائٹ انڈیا“ کے نعرے لگتے ہیں اور دوسرے وقت میں اسی پر ٹیرف لگا کر اسے ”مردہ معیشت“ کہا جا رہا ہے۔ کبھی پاکستان کے ساتھ معاہدے کیے جاتے ہیں اور یہاں کے وسائل کو اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور کبھی پابندیاں لگانے کے لیے ”پریسلر ترمیم“ جیسے دباؤ پیدا کیے جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں سوال یہی ہے کہ قومی وقار کہاں ہے؟ قومی شناخت کہاں ہے؟ اور قومی آزادی کی جدوجہد کہاں ہے؟

قرآن تمھارے لیے عبرت ہے، تمھیں آئینہ دکھاتا ہے، عقل پیدا کرتا ہے اور شعور پیدا کرتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی عظیم الشان جدوجہد تمھارے لیے اسوۂ حسنہ، نمونہ اور معیار ہے۔ اس لیے اگست کے مہینے میں قرآن کو اس نقطۂ نظر سے پڑھو کہ ظالموں کے خلاف قرآن کیا کہتا ہے اور تمھاری کیا ذمہ داریاں ہیں۔ آزادی اور قومیت کی بات کرنا، قومی حفاظت کی جدوجہد کرنا، اپنی معیشت کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا اور اپنے آپ کو آگے بڑھانے کے لیے کردار ادا کرنا سب سے پہلی قومی ضرورت ہے۔ قرآن کا بنیادی پیغام قومی وقار کو بلند کرنا ہے، اور جو قوم اپنی نسل، اپنے آبا و اجداد، اپنے اولیاء اللہ، اپنے بزرگوں اور اپنی تاریخ کو بھول جاتی ہے، وہ دنیا اور آخرت دونوں کے خسارے میں مبتلا ہو جاتی ہے“۔

تحریر: پروفیسر ڈاکٹر امجد علی شاکر، لاہور

عباس شاد بھی چلے گئے

زندگی بھی کیا عجیب ہوتی ہے۔ آپ اتفاق سے ایک جگہ سے گزرتے ہیں اور پھر وہاں جانا، وہیں سے گزرنا روزانہ کا معمول بن جاتا ہے۔ ایسے ہی آپ ایک شخص سے ملتے ہیں، پھر اکثر اس سے ملاقات ہونے لگتی ہے۔ کسی راستے میں، کسی بزم میں، کبھی کسی موڑ پر اور کبھی اتفاق سے۔ پھر آپ سمجھتے ہیں کہ اس سے ملاقات روزانہ کا وظیفہ بن جاتا ہے۔ عباس شاد سے کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا۔ کہیں اچانک کسی بک شاپ پر کوئی کتاب نظر آئی جو کہ ''مکی دار الکتب'' نے شائع کی تھی۔ پتا چلا ایک نوجوان عالم ہیں، نام اُن کا ''عباس شاد'' ہے۔ مولانا سندھیؒ کے فکر و فلسفہ کو خوب مانتے ہیں۔ اس حوالے سے کتابیں چھاپتے ہیں۔ اب بھلا ایسے بندے سے ہم کب تک نا آشنا رہتے۔ اُن سے اچانک ملاقات بھی ہوگئی۔ وہ مجھے بھی جانتے تھے، میں بھی اُنھیں پہچاننے لگا۔

اُن کا دارالشعور صفانوالہ چوک میں قائم تھا۔ اب اُن سے اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں۔ یہاں بہت سے دوست آتے تھے، بیٹھتے اور گپ کرتے۔

ہم چند دوست جمع ہوتے یعنی ریاظ صاحب، عباس صاحب، سعید صاحب اور یہ خاکسار۔ ہم لوگ خلیل صاحب کی یادیں سنتے، عباس صاحب انھیں ریکارڈ کرتے۔ خلیل صاحب سادہ مزاج آدمی تھے، بات بہت سادگی سے کرتے۔ اُن کی سادگی بے ریا سادگی تھی جس میں عجز ہی عجز تھا۔ جس میں وہ اپنا تجزیہ اور دانشوری کبھی پیش نہ کرتے۔ کبھی کبھی کوئی کوئی سوال چھوڑ جاتے۔ اُن کے سوالات دانش و بینش پر مبنی ہوتے۔ اُن کی گفتگو کا کمال یہ تھا کہ وہ واقعات پیش کرتے اور انتہا پر کبھی حیرت، کبھی سوال اور کبھی اپنی علمی کم مائیگی پر بات ختم کر دیتے۔ وہ دانشور نہیں تھے، مگر اُن کے سوالات میں دانش ہی دانش تھی۔

عباس شاد پبلشنگ اور کتاب فروشی میں نئے نئے تجربے کیا کرتے تھے۔ احمد سلیم نے ایک آئیڈیا دیا کہ سال بھر کی اہم خبریں جمع کر کے شائع کر دی جائیں۔ یہ مستقبل میں تاریخ ہوں گی۔ محمد سعید نے اسی نہج پر پاکستان کے عنوان سے کتاب لکھی۔ اس کتاب میں 1944ء سے 1947ء تک کی خبریں ہیں۔ سچ ہے اس پیریڈ کی اس سے بہتر تاریخ پڑھنے کو ملی نہیں۔ کاش کوئی شخص زیادہ ماہ و سال کی تاریخ، اسی انداز میں لکھ دے۔ عباس شاد بھی بہت سے کام کر چکے تھے اور بہت سے کام کر رہے تھے، بہت سے کام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، مگر یہ سارے کام یہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ سچ ہے: یہ کارِ دنیا کسے تمام کرد۔

عباس شاد پاکپتن کے قریب کسی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ وہ وٹو برادری سے تعلق رکھتے تھے، اس برادری کے لوگ اس علاقے میں زمیندارہ اور سیاست کرتے ہیں۔ یہ گاؤں سے نکلے اور حصولِ علم کے راستے پر چل پڑے۔ والد نے چاہا ہوگا، بیٹا علمِ دین حاصل کرے اور دنیا و آخرت کے لیے نیکی اور نیک نامی کمائے۔ والد کی خواہش پوری ہوئی۔ بیٹا دین کا عالم بن گیا۔ علم کی تقسیم تو نہیں ہوتی۔ دین کے عالم پر یہ قدغن تو لگا نہیں سکتے کہ وہ دوسرے شعبوں سے دُور رہے، ان کا علم حاصل نہ کر سکے۔ علمِ دین کے حصول میں یہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ تک پہنچ چکے تھے۔ ابن خلدون کے نزدیک دین کا مقصد آخرت کو بہتر بنانا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کہتے تھے دین کا مقصد دنیا و دین دونوں کو بہتر بنانا ہے۔ عباس شاد یہ جان کر کہ علم کی مختلف دنیاؤں کا سفر کرتے رہے۔ اس سفر میں انھیں کتاب سے محبت ہوگئی، کتاب کی محبت ان کی زندگی کا محور و مرکز ہوگئی۔ وہ کتابیں پڑھتے، شائع کرتے اور کتابوں کو ان کے طلب گاروں تک پہنچاتے۔ کتاب ان کی زندگی میں ایسے تھی جیسے کسی بدوی عرب کی زندگی میں اونٹ، وہ اونٹ کا گوشت کھاتا، اونٹ پر سواری کرتا، اونٹ کے خیمے میں رہتا، اونٹ کی چگنیاں جلاتا، اونٹ کے بالوں کا لباس پہنتا، اونٹ کے گیت گاتا اور اونٹ کے ساتھ جیون بتا دیتا ہے۔ ایسے ہی کتاب عباس شاد کا شوق بھی تھا، کاروبار بھی، اس کے چاروں طرف کتابیں تھیں، وہ انھی کے بارے میں سوچتا، باتیں کرتا، تقسیم کرتا اور انھی کے ساتھ جیتا تھا۔

کتابیں عباس شاد کا مشن تھا، کتابیں ہی اس کا ذریعہ روزگار تھا، کتابیں اس کی پہچان تھیں اور کتابیں اس کے خواب تھے۔ وہ دارالشعور کی کتابیں روزگار کے لیے شائع کرتا تھا اور ادارہ رحیمیہ قرآنیہ کی کتابیں اپنے مشن اور مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے۔ دارالشعور کی کتابیں ذریعہ روزگار تو تھیں، مگر وہ ہمیشہ ذریعہ ہی رہیں، مقصد نہ بن سکیں۔ مقصد تو صرف علم تھا، فکر تھا اور نظریہ تھا۔ عباس شاد کی مجھ سے آخری گفتگو مضطر عباسی مرحوم کی ایک کتاب کے حوالے سے ہوئی۔ یہ کتاب خالص علمی اور خالص نظریاتی تھی۔ عباس نے اس کا مسودہ میری معرفت حاصل کیا۔ وہ اس کے مسودے پر کام کر رہا تھا کہ اچانک وہ زندگی کی راہوں سے چلتے چلتے موت کے راستے پر چل دیا۔ اُس کی سناونی آگئی اور وہ کوہِ ندا کے پار چلا گیا۔

عباس کا ہسپتالوں میں مستقل آنا جانا رہتا تھا، کبھی خود بیمار ہوئے اور کبھی اُن کے بیٹے۔ پتا نہیں عمر کے کس حصے میں اُن کا بیماریوں سے آمنا سامنا ہوا، شناسائی ہوئی اور دوستی ہوگئی۔ ذیابیطس تو جی کا جنجال ہوتا ہے۔ جب کسی سے اس کی میل ملاقات ہو جائے، یہ پکی دوستی کر لیتی ہے، زندگی کے آخری کنارے تک ساتھ نبھاتی ہے۔ یہ بیماری کیسے لگی، مجھے نہیں معلوم، میں بیماریوں پر زیادہ گفتگو نہیں کرتا۔ زندگی ہے تو بیماریاں بھی ہوں گی۔ اب جس کسی سے بات کریں، وہ ذیابیطس اور بلڈ پریشر کا شکوہ کرتا سنائی دیتا ہے۔ عباس بلڈ پریشر کا شکوہ نہیں کرتے تھے، ویسے تو وہ ذیابیطس کی شکایت بھی نہیں کرتے تھے، صرف حکایت کرتے تھے۔ باہمت تھے، بیماریوں کو جھیل رہے تھے اور کام کیے جاتے تھے۔ صاحب دل تھے، دل میں درد اٹھا اور جان لے کر ختم ہوا۔

ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ عباس شاد بھی کبھی یادگار بن جائیں گے اور ہم انھیں

یاد کرتے رہ جائیں گے۔ وہ تاریخ سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ تاریخ پر کتابیں چھاپتے تھے اور اُن لوگوں کی یادیں جمع کرنے کے خواہاں تھے جو تاریخی لمحوں میں زندہ تھے یا تاریخی لمحوں کو زندہ دیکھنے کے آرزومند تھے۔ احمد سلیم، تاریخ ساز واقعات کو جمع کرتے تھے، ایسی ہی تین کتابیں عباس شاد نے شائع کیں۔ خلیل صاحب کی یادیں جمع کیں، حافظ تقی الدین کی کتابیں شائع کیں۔ حافظ تقی الدین تاریخی لمحوں کے عینی شاہد تھے۔ وہ 1947ء کے فسادات کی تفصیل جانتے تھے اور بتاتے بھی تھے۔ پنجاب میں فسادات کے حوالے سے راولپنڈی کی تاریخ بہت اہم ہے۔ وہاں 6 مارچ 1947ء کو فسادات شروع ہوئے۔ راولپنڈی کے دیہات میں فساد شروع ہوا اور پھیلتا گیا۔ حافظ تقی الدین ان واقعات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مثبت اور منفی دونوں طرح کے کرداروں کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ وہ صرف جانتے ہی نہیں تھے، بتاتے بھی تھے، لکھتے بھی تھے۔ میں نے عباس شاد کے کہنے پر صوفی امیر خسرو پر بھی لکھا تھا۔ شاید ایک آدھ اور کتاب پر بھی دیباچہ لکھا۔ یہ وہ علمی سرگرمیاں تھیں، جن کے مرکز میں عباس شاد کھڑے تھے۔

2025ء اب پا بہ کاب ہے، مگر اس سال کتنے ہی پیارے جان ہار گئے۔ 2020ء سے ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس سال بھی بہت سے دوست ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ فیس بک کھولتے اور فون اُٹھاتے ڈر سا لگتا ہے۔ بہت سوں کے چلے جانے سے اب زندگی کے معنی ہی کم ہو گئے ہیں۔ زندگی بے ترتیب سی ہونے لگی ہے۔ اس بے ترتیبی میں کب تک معانی تلاش کرتے رہیں گے۔ دوستوں کے ساتھ عام سی باتیں کرتے تھے، وہ بامعنی باتیں لگتی تھیں۔ اب کس کو دل کی کتھا سنائیں، کسے جی کا حال بتائیں۔ کچھ باتیں ہر دوست کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں، وہ دوسروں سے کی نہیں جاتیں۔ کچھ حکایتیں ہر کسی سے کہی نہیں جاتیں۔ کسی ایک شخص کے جانے سے زندگی کی کئی کڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ کہانی بے ربط سی ہونے لگتی ہے۔

3/دسمبر 2025ء کو اچانک فیس بک پر ایک خبر اُبھری۔ محمد عباس شاد دنیا سے چلے گئے۔ میں خبر دیکھ کر چونکا، کچھ گھبرا سا گیا۔ جی چاہا اور یہ آرزو کی کہ اِس کی تردید آ جائے، مگر خبر دینے والے دوست حافظ محمد ندیم ثقہ شخص ہیں۔ وہ کیوں کر غلط خبر عام کریں گے، مگر دل برابر ہی آرزو کیے جا رہا تھا: الٰہی مرگ یوسف کی خبر سچی نہ ہو۔

کچھ ہی دیر میں یہ خبر بہت سے لوگوں کے پیج سے اُبھرنے لگی۔ میں دیر تک اُن کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُن کی یادوں کو یاد کرتا رہا۔ اُن کا ذکر تصویروں کی صورت پردۂ ذہن پر اُبھرتا رہا۔ اُن کے بیٹے کی بیماری کا خیال آیا۔ وہ کس محبت اور محنت سے بیٹے کے علاج کے لیے کوشاں رہے۔ وہ اس معاملے میں بڑی پریشانی جھیل چکے تھے۔ اب بھی وہ مسلسل ہی پریشانی جھیل رہے تھے۔ جوان بچہ ایک بڑی اور خوفناک بیماری کا شکار ہو چکا تھا۔ اُس کے مزید علاج کے لیے ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ بچہ گھر میں تھا اور علاج کے انتظار میں بیٹھا پریشانی جھیل رہا تھا۔ ظاہر ہے وہ باپ تھے۔ وہ بچے کے درد کو اپنے دل میں بچے کی طرح ہی محسوس کر رہے تھے۔ بچہ اب چڑچڑا ہو چکا تھا، وہ باپ تھے، بیٹے کا درد سمجھتے تھے۔ اُس کے درد کو اپنے دل کا درد سمجھ رہے تھے۔ اپنے دل کا درد سمجھ ہی نہیں رہے تھے، یہ اُن کے دل کا درد تھا۔ وہ یہ درد بتاتے نہیں تھے۔ وہ اِس بیٹے سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ بہت ذہین تھا، اپنے ذہن سے سوچتا تھا۔ سوال اُٹھاتا تھا۔ اپنی رائے رکھتا تھا۔ اپنے ذہن سے سوچ کر فیصلہ کرتا تھا۔ وہ اکثر اُس کی خوبیوں کا، اُس کی انفرادیت کا اور اُس کی ذہانت کا تذکرہ کرتے۔ وہ اُسے مجھ سے ملانا چاہتے تھے مگر قدرت کو شاید اب تک یہ منظور نہ تھا۔

میں عباس شاد کو رات دیر تک یاد کرتا رہا۔ صبح اٹھا تو نماز کے بعد پہلا کام یہ کیا۔ فیس بک کھولی تا کہ عباس شاد کے جنازے کی خبر مل سکے۔ پتا چلا نمازِ جنازہ دو بجے ہو گی اور ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ میں ہو گی۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ وہ ادارے کے آغاز سے اب تک ادارے کا حصہ رہا تھا۔ اُس کی سرگرمیوں میں شریک تھے۔ اس سے متعلق ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔ وہ شعبہ نشر و اشاعت اور مطبوعات کے انچارج تھے۔ ادارے کی کتابیں اُن کے ذوق طباعت و اشاعت کا مظہر ہوتیں۔ یہ کتابیں اُن کے اشاعتی ادارے میں بھی موجود ہوتیں اور ادارے کے بک سٹور پر بھی موجود ہوتیں۔ ادارے کی کتابیں خاص طور پر بہت اہم تھیں، اس کا کریڈٹ مولانا مفتی عبدالخالق آزاد کو جاتا ہے۔ یہ صوری لحاظ سے خوب صورت اور جاذب نظر ہوتی تھیں، اس کے کریڈٹ میں عباس شاد کا بہت حصہ ہوتا تھا۔ میں عباس شاد اور ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ کے بارے میں سوچتا، یاد کرتا اور خیالوں میں مگن ادارے کی طرف روانہ تھا۔ عباس شاد کے حوالے سے بہت کچھ ذہن میں آیا اور بہت سی یادیں یاد آتی رہیں۔

تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی انیسویں صدی کے شروع میں سفر کا آغاز کرتی ہے۔ انیسویں صدی کی آخری چار دہائیوں میں جمعیۃ طلبائے اسلام نے بنیادی کام کیا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے حوالے سے بہت اہم کام کیا تھا۔ نئی نسل کے لوگوں کو ان اکابر کے ناموں سے، ان کے افکار سے اور ان کی تاریخ اور تاریخی جدوجہد سے آشنا کیا تھا۔ اس آشنائی نے بہت سوں کو بہت کچھ دیا تھا۔ اعتماد، فکر، تخیل اور تحقیق کا جذبہ وجنوں اور ہمت و حوصلہ دیا تھا۔ یہ لوگ اکیسویں صدی میں آئے تو نظم کو نیا نام دیا گیا۔ دائرۂ کار وسیع ہو چکا تھا۔ علمی کام میں وسعت اور گہرائی آ گئی تھی۔ عباس شاد نے دونوں ادوار دیکھے تھے۔ وہ دوسرے دور میں کام کا ہنر بھی جان گئے تھے اور جذبہ وجنوں میں بھی کمی نہ آئی تھی۔ تنظیم کی کتابیں اور رسالے چھپ رہے تھے۔ اس کام کے نگران عباس شاد تھے۔ مطبوعات میں ایک سلیقہ آ گیا تھا۔ ''رحیمیہ'' ہر ماہ شائع ہو رہا تھا۔ ''شعور و آگہی'' چھپ کر آنے لگا تھا۔ رحیمیہ کے بارہ صفحات پر زیادہ سے زیادہ مواد جمع ہو کر چھپ رہا تھا، یہ عباس شاد کی ادارت کا کمال تھا۔ انہوں نے بتایا ایک رسالہ اور بھی ہے جو صرف کارکنوں تک جاتا ہے، یہ سب چھپ رہا تھا۔ اسی جذب و شوق کے باعث

Monthly **RAHIMIA** Lahore CPL No. 59

انھوں نے ''دارالشعور'' کے نام سے ایک رسالہ شروع کیا۔ چند ایک شمارے چھپے، پھر یہ آن لائن ہوا، پر پھر آخر کو آف لائن ہوگیا۔ ادارے کے رسائل حسن و خوبی سے چھپتے رہے۔ یہ ایثار ہے، لگن ہے اور اسے عشق کا نام دیا جانا چاہیے۔

عباس شاد تحریک اور جدوجہد میں دلچسپی رکھتے تھے۔ سنگھرش اُن کے مزاج کا حصہ تھا۔ تنظیم اور جدوجہد کے لیے وہ ادارہ رحیمیہ اور تنظیم فکرِ ولی اللّٰہی میں وقف رہے۔ اس تنظیم اور ادارے کے لیے تو وہ ہمہ تن اور ہمہ وقت حاضر تھے، مگر اُنھوں نے پبلشرز کی تنظیم اور جدوجہد میں بھی دلچسپی لی، اس کے لیے خدمات پیش کیں، اس میں اپنے رفقا اور دوستوں کے دست بازو بنے۔ اس تنظیم میں انھیں بہت تجربات حاصل ہوئے۔

ربِ کریم کا شکر ہے، میں آج اُن کا ذکرِ خیر کر رہا ہوں۔ اُن کے ساتھ دوستی اور رفاقت نعائمِ فطرت میں سے تھی۔ ایسی نعمتوں کا تذکرہ تحدیثِ نعمت میں شامل ہے۔ دعا ہے ربِ ذوالجلال اُنہیں اپنی نعمتوں کے جہان میں رکھے۔ (آمین!)

بقیہ

آزادی، گمشدہ قیادت اور برِعظیم کا مستقبل

اگست کا مہینہ صرف جشنِ آزادی کا نہیں، بلکہ محاسبۂ نفس کا بھی مہینہ ہے۔ یہ ہم سے سوال کرتا ہے: کیا ہم نے آزادی کے اصل مقصد کو سمجھا؟ کیا ہم نے اُن رجالِ حق کی جدوجہد کو پہچانا جنھوں نے غلامی کے اندھیرے میں آزادی کا چراغ جلائے رکھا؟ اور کیا ہم اپنی آنے والی نسلوں کو وہ فکری سرمایہ منتقل کر رہے ہیں جس پر ایک باوقار، خودمختار اور مستحکم معاشرہ تعمیر ہوسکتا ہے؟ حقیقی آزادی؛ فکری بلندی، اخلاقی، معاشی اور تہذیبی خودمختاری کا نام ہے۔ اسے امام ائمۂ انقلاب حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ سمیت دیگر اکابرینِ تحریکِ آزادی جیسی عظیم ہستیوں کی انقلابی بصیرت سے روشنی لے کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو برِعظیم کو سامراجی وراثت کے مضر اثرات سے نجات دلا کر ایک باعزت، خوددار، مستحکم اور عادلانہ مستقبل کی طرف گامزن کرسکتا ہے۔ (مدیر)

بقیہ

عثمانی سلطنت کے نویں حکمران؛ سلطان سلیم اوّل

تبریز کے قریب شاہ اسماعیل صفوی کی تازہ دم فوج کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ عثمانی فوج ایک ہزار میل کا دشوار گزار طویل سفر کر کے مقابلے کے لیے اُتری تھی۔ مقابلے میں عثمانی توپ خانے نے گولے برسانے شروع کر دیے۔ ایرانیوں کے پاس یہ ٹیکنالوجی نہیں تھی، جس پر صفوی کی حکومت کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ شاہ اسماعیل زخمی ہوگیا اور بہ مشکل تمام جان بچا کر بھاگ گیا۔ اور اس طرح سلیم تبریز میں فاتحانہ داخل ہوا۔

(باقی آئندہ قسط میں)

دینی مسائل

اس صفحے پر قارئین کے سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں!

از حضرت مفتی عبدالقدیر شعبۂ دارالافتا ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

سوال شادی میں ''کفو'' اور برابری سے کیا مراد ہے؟

جواب شادی میں ''کفو'' کا اصل مقصد میاں بیوی کے درمیان مزاج، عادات اور طرزِ زندگی کی ہم آہنگی ہے۔ اس کے لیے دونوں کو دین دار اور معاشرتی اخلاق کا حامل ہونا چاہیے۔ موجودہ دور میں تعلیم، ذہنی سطح اور سوچ کی مطابقت بھی اہم ہے۔ معاشی اور سماجی حیثیت میں بھی زیادہ فرق نہ ہو، تاکہ باہمی رہن سہن اور میل جول میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

سوال ہمارے گاؤں میں بعض لوگ میت کے کفن پر کلمۂ شہادت لکھ دیتے ہیں، نیز میت کو قبر میں اُتارنے کے بعد اس پر آیاتِ قرآنیہ، اذکار یا درود شریف لکھی ہوئی چادر بھی ڈال دیتے ہیں۔ ان کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب میت کے کفن پر کلمۂ شہادت لکھنا جائز نہیں، البتہ اگر روشنائی کے بغیر صرف انگلی کے اشارے سے کلمہ لکھ دیا جائے تو اس کی گنجائش ہے۔ نیز میت پر قرآنی آیات، اذکار یا درود شریف والی چادر ڈالنا بھی میت کے بدنی رطوبات سے ملوث ہونے کے سبب خلافِ ادب ہے، جس سے بچنا چاہیے۔ اس طرح کے ایک سوال کے جواب میں مفتی اعظم حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''کفن پر کسی ایسی چیز سے کلمہ لکھنا کہ جس سے نقش ظاہر ہوجائیں، جائز نہیں۔ صرف انگلی سے لکھ دینا مباح ہے کہ نقش ظاہر نہ ہوں''۔ مزید فرماتے ہیں کہ: ''عہد نامہ یا کوئی اَور لکھی ہوئی چیز کفن یا قبر میں رکھنا جائز نہیں ہے''۔ (کفایت المفتی، کتاب الجنائز، دوسرا باب: میت کی تجہیز و تکفین، ج:4، ص:48و53، طبع: مکتبہ امدادیہ، ملتان)، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

سوال (1) خرید و فروخت میں ''غبنِ فاحش'' سے کیا مراد ہے؟

(2) ایک دوکاندار کوئی چیز ایک لاکھ بیس ہزار پر فروخت کرتا ہے اور دوسرا وہی چیز (اسی کوالٹی اور مقدار میں) ایک لاکھ ساٹھ ہزار کی دیتا ہے تو کیا دوسرے شخص کا اس طرح بیچنا ''غبنِ فاحش'' کے زمرے میں آئے گا؟

جواب (1) ''غبنِ فاحش'' سے مراد یہ کہ کسی سامان یا خدمت (سروس) کی مارکیٹ میں مروجہ بلندترین شرح سے کہیں زیادہ قیمت وصول کر لی جائے۔ مثلاً ایک چیز مارکیٹ میں عام طور پر 50 تا 60 روپے کے درمیان فروخت ہوتی ہے اور 70 روپے اس کی آخری حد ہے، مگر کوئی دوکاندار خریدار کی لاعلمی یا مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ 60 والی چیز کو اس سے اوپر کے دام میں مثلاً 100 یا 200 میں بیچے تو یہ عمل ''غبنِ فاحش'' کہلائے گا، اس قدر منافع خوری شرعاً مکروہ تحریمی ہے۔

(2) اگر اس چیز کی قیمت مارکیٹ میں زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ بیس ہزار روپے ہے تو اس کو ایک لاکھ ساٹھ ہزار میں بیچنا ''غبنِ فاحش'' ہے۔

مدیر اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع و ناشر نے اے۔ جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ ''رحیمیہ'' رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئنز روڈ لاہور سے جاری کیا۔